

تلخیص و ترجمہ عربوں کی قومی تحریک اور جنگ

انگریزی کے مشہور رسالہ "دی رائٹ ٹریل" ستمبر ۱۹۴۱ء میں مندرجہ بالا عنوان سے ایک بصیرت افروز مقالہ شائع ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ عربوں کو کس طرح گذشتہ جنگ عظیم میں حکومت خود اختیاری کا سرباز دکھا کر ترکوں کی مدد کیا گیا۔ اور پھر جنگ کے ختم پر جب ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا تو ان میں برطانیہ اور فرانس کے خلاف شکایات کے پیدا ہو جانے کے باعث کس طرح بے چینی پیدا ہوئی اور اس کے دیگر اسباب و نتائج کیا تھے۔ اگرچہ ہم پورے مضمون سے متفق نہیں ہیں۔ تاہم اس میں عربوں کی قومی تحریک سے متعلق بعض نہایت مفید اور اہم معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ اس لئے ہم ذیل میں اس مقالہ کا ملخص ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

مئی ۱۹۴۱ء کا ہنگامہ عراق، اہل برطانیہ کے لئے بالکل خلاف توقع تھا۔ اخبارات میں مشرق وسطیٰ کی جنگ کے آغاز سے براہِ خبریں آرہی تھیں کہ مفتی اعظم فلسطین جیسے چند کٹر دشمنوں کو چھوڑ کر عرب عام طور پر ہمارے ساتھ ہیں، اپریل میں تو برطانیہ اخبارات اور ریڈیو بار بار یہ کہہ رہے تھے کہ عراق کی "باغی حکومت" اس معاہدہ کی جو برطانیہ اور عراق کے درمیان ہوا تھا پوری پابندی کر رہی ہے۔ ایسی حالت میں اگر جابانیہ پر بمباری کی اطلاع سنگ آبد و سخت آمد ثابت ہوئی تو کیا تعجب ہے۔

درحقیقت، عراق کا یہ ہنگامہ اس بات کی قوی علامت ہے کہ عربوں میں نفرت کا ایک عام جذبہ پایا جاتا تھا اور عراق کے لیڈر محض نازیوں کے بل بوتے پر مقابلہ نہیں کر رہے تھے بلکہ انھیں یہ بھی خیال تھا کہ عرب کی دوسری حکومتیں ان سے ہمدردی کریں گی لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ عرب

رضا کاروں نے اپنا دامن بچایا اور عرب کی حکومتوں نے اپنے رویہ سے ان کے خیال کی تردید کی تو انھیں بالوسی ہوئی اور ان کی ہمتیں ٹوٹ گئیں، مگر اب عراق کے اندر آزادی کی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اور اگرچہ اس کے اثرات ہنوز اچھی طرح سے ظاہر نہیں ہوئے ہیں، لیکن سنہ ۱۹۱۲ء کی تحریک کو اس سے کچھ نسبت نہیں ہے۔

عراق کا یہ واقعہ مالک عربیہ کی باہمی سیاسی کشیدگی اور برطانیہ عظمیٰ اور اس کے اتحادیوں کے درمیان مسائل پر پوری روشنی ڈالتا ہے، ان میں سب سے اہم مسئلہ عراق اور شام کا ہے، مگر بنیادی طور سے تمام مالک عرب میں جن میں مصر بھی داخل ہے انھیں مسائل کا سامنا ہے، سچ پوچھئے تو یہ مسائل عالم عربی کے ساتھ ہی خاص نہیں ہیں بلکہ ان کا دائرہ شرق وسطیٰ کی ان سیاسی پیچیدگیوں تک وسیع ہے، جو خصوصیت کے ساتھ جنگ عظیم ۱۸-۱۹ء کے بعد عربوں کے غم و غصہ اور وہاں کے سیاسی درو جزر کا باعث بنی رہی ہیں۔

ایشیائے مالک عرب تین سو برس تک عثمانی سلطنت (Ottoman Empire) کی بدولت جو ان کی ضروریات اور ان کے تحفظ کی حامل تھی، عالمگیر تلخ سیاسی حقائق و واقعات سے محفوظ رہے، یہاں حاکم و محکوم کا مذہب ایک تھا اس بنا پر ان میں اختلاف بالکل ناپید تھا۔ صرف بادیشینوں کا ایک گروہ ایسا تھا جو غیر ملکی حکومت سے شدید تعصب رکھتا تھا اور ہمیشہ مقابلہ برپا کرتا تھا، یہ واقعہ تو اسی صدی کے اوائل میں پیش آیا کہ تعلیم یافتہ افسروں اور متوسط طبقہ کے افراد کو اپنا شاندار ماضی یاد آیا اور وہ اُسے واپس لانے کے لئے عثمانی سلطنت کے خلاف ایک تحریک کرنے لگے۔ حالانکہ ان میں سے اکثر کو عثمانی سلطنت کی ذات سے کوئی چشم زخم نہ پہنچا تھا۔ انھیں صرف ترکوں کے ساتھ ہمسری کا ضبط تھا۔ نوجوان ترک قبل از جنگ ۱۹۱۴ء سے عربوں کو عثمانی حکومت کے خلاف بھڑکانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اب عرب قومیت کے نام پر شریف مکہ کی بغاوت اور ترکی کے مقابلہ پر اس کی فوجوں

کی کامیابی نے وہ کام جو ان سے نہ ہو سکا تھا پورا کر دیا۔ اس وقت سے شام اور عراق عرب کی قومیت کا جذبہ بھی بھڑک اٹھا۔

جنگ عظیم نومبر ۱۹۱۸ء کے خاتمہ کے بعد یہ قوم پرست طبقہ اپنی کامیابی پر بہت خوش اور پر جوش تھا۔ سر ہنری میکموہن (Sir Henry Macmohan) نے جو خطوط شریف مکہ کے نام لکھے تھے ان سے اور پھر فرانس و برطانیہ کی طرف سے شام و عراق کی آزادی کے متعلق جو اعلانات شائع ہو چکے تھے ان سے عربوں کو یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ اب فوراً ایک خود مختار عرب حکومت قائم ہو جائیگی جس کی حدود مغربی ایشیا کے کل یا اس کے ایک بڑے حصہ پر مشتمل ہوں گی، لیکن بعد میں جب عربوں کو اس امید میں ناکامی ہوئی تو وہ ان کے لئے سخت نا قابل برداشت ثابت ہوئی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ (خود مختار) عرب حکومت قائم کرنے کے بجائے برطانیہ نے عراق و فلسطین میں اور فرانس نے لبنان میں قدم جانے شروع کر دیئے ہیں تو انہوں نے پہلے پہل تو فرانس و برطانیہ کو وعدہ شکنی اور غداری کا مورد قرار دیا اور پھر ناکام تشدد کے مظاہروں سے اپنے غم و غصہ کا اظہار کرنے لگے۔ لیکن ان مظاہروں کا اثنائے یہ ہوا کہ شام کی زنجیروں کے حلقے اور ملا دیئے گئے اور فوری اتحاد عرب کی آخری توقعات بھی پر لگندہ ہو کر رہ گئیں۔

مشرق وسطیٰ میں یوں تو بیس برس کے اندر بہت سے انقلابات رونما ہوئے لیکن بنیادی عناصر میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ چنانچہ علاوہ اس کے کہ برطانیہ عظمیٰ کا اقتدار فلسطین اور عرب کے دوسرے حصوں پر قائم ہے، مصر، عرب اور عراق بھی برطانیہ کے زبردست اثر کے ماتحت ہیں، دوسری طرف تحریک عراق کے آغاز تک شام اور لبنان پر فرانس کی حکومت قائم رہی۔ ان حالات کی بنا پر عربوں کا قومی جذبہ برابر مشتعل اور اس کا جوش و خروش بڑھتا ہی رہا۔ پھر دونوں پارٹیوں کے باہمی تعلقات ناگزیر طور پر واقعات کی رفتار سے بھی بہت کچھ متاثر ہوئے ہیں، لیکن ان ایام کی مفصل تاریخ بیان کرنے سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اس قدرتی عمل کے نتائج پر غور کیا جائے۔

فرانس و عرب کے تعلقات پر ان تغیرات کا بہت کم اثر پڑا، شام پر فرانسیسی انتداب (Mandate) کے قائم ہونے کے وقت ہی شامی مسلمانوں میں انتہائی اشتعال تھا، اس آگ کو فرانس کے نظم و نسق نے اور تیز کر دیا۔ شامی عربوں کو فرانسیسی حکومت سے تین بڑی شکایتیں تھیں۔ پہلی یہ کہ فرانسیسی ارباب اقتدار نے مذہبی اور مقامی رقابتوں کو جو شامی اتحاد کے راستہ میں حائل تھیں کم کرنے کے بجائے ان کے احساسات کو اور ابھار دیا ہے، تاکہ وہ اپنی گرفت خوب مضبوط رکھ سکیں۔ فرانس نے اپنی اس پالیسی کو اس طرح عملی جامہ پہنایا کہ سب سے پہلے لبنان کے عیسائیوں کے تحفظ کی آڑ لے کر لبنان کی سرحد کو فوجی نقطہ نظر سے مستحکم کیا (اگرچہ اس حکمت عملی کی وجہ سے لبنان کے مارونی عیسائیوں کے حامی تعداد کے لحاظ سے اقلیت میں رہ گئے) اس میں جنوب اور شمال کے ساحلی علاقے بھی داخل تھے اور اس الحاق کا دامن طرابلس (Tripolis) اور سیڈون (Sidon) کی بندرگاہوں اور اس زر خیز وسطی نشیبی خطہ تک وسیع تھا جو لبنان اور ایٹلی لبنان کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ جدید لبنان عظمیٰ کو ایک جداگانہ ریاست قرار دیا گیا جس کا صدر اور گورنمنٹ بالکل الگ اور مستقل تھی۔

اب شام کے جو حصے باقی رہ گئے تھے ان میں بھوٹ ڈالنے اور ان میں تقسیم کرنے کی پالیسی کی تکمیل اس طرح کی گئی کہ جنوب مشرق میں جبل دروین علوی علاقہ جو لبنان عظمیٰ کے شمالی ساحل پر واقع ہے اور جس میں ساحل کے عقبی پہاڑ بھی شامل ہیں۔ پھر ضلع اسکندونہ جو لبنان عظمیٰ کے شمال میں واقع ہے، اور جزیرہ جودریائے فرات کے مشرق میں ایک عراقی میدان ہے۔ ان سب کا نظم و نسق غلیحہ علیحدہ قائم کر دیا گیا۔

دوسری شکایت یہ تھی کہ جب عراق نہایت تیزی کے ساتھ حکومت خود اختیاری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شام اس وقت بھی نوآبادیاتی نظم و نسق کا ایک جزو لاینفک بنا رہا جس کے ماتحت تمام پبلک محکموں میں بھی فرانسیسی افسروں اور عہدہ داروں کی بھہراہتی۔ اقتصادی لحاظ سے شام فرانس کے لئے صرف ایک مشین

کی سی حیثیت رکھتا تھا اور اس کے تمام اقتصادی وسائل و ذرائع فریسی دستبرد کا شکار بنے ہوئے تھے۔

۱۹۳۶ء میں حکومت فرانس میں انقلاب پیدا ہوا تو یہ امید بچانہ تھی کہ اب اس کی پالیسی میں بھی دعو بدل ہوگا۔ اس بنا پر انتہائی حکومت کی جگہ کسی دوسرے نظام کو قائم کرنے کیلئے گفتگوؤں کا آغاز ہوا، اور اس سلسلہ میں دو معاہدوں پر ایک شام کے ساتھ اردو سرالبنان کے ساتھ دستخط بھی ہو گئے۔ سمجھوتہ کی امیدیں شام کے قوم پرستوں نے تو یہاں تک کیا کہ لبنان عظمیٰ کے حدود کو تسلیم کر لیا۔ لیکن پیرس کے ارباب سیاست نے ترکی کی ان امیدوں کو مطمئن کرنے کے لئے جو اس معاہدہ سے پیدا ہو گئی تھیں اسکندریہ اور انطاکیہ کا علاقہ تو ترکی کو دیدیا۔ مگر شام کی قوم پرست جماعت کے مطالبوں پر کوئی توجہ نہیں کی اور پھر نوآبادیاتی طرز حکومت وہاں قائم کر دی۔ اہل شام کی حکومت فرانس کے خلاف پتیسری اور سب سے زیادہ سخت شکایت تھی۔

اب رابڑانیہ عظمیٰ کا معاملہ تو اگرچہ شروع شروع میں عربوں کو برطانیہ کے ساتھ اس قدر شدید دشمنی نہیں تھی جتنی کہ فرانس کے ساتھ تھی مگر پھر بھی عراق اور مصر میں جو تصادم انگیزہ لگائے برپا ہوئے تھے اور پھر فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی جو تحریک جاری تھی، ان سب چیزوں نے برطانوی ہٹلر کے منصوبوں کی طرف سے عربوں کے دلوں کی بدگمانی کو پہلے سے زیادہ قوی کر دیا تھا۔ یہ بدگمانی کبھی کم نہیں ہوئی اور برابر بڑھتی ہی رہی۔ اتنا ضرور ہو کہ برطانیہ نے جب بڑے پیمانے پر مصر و عراق سے معاہدہ کر لینے پر آمادگی ظاہر کی تو یہ شکوک و شبہات کسی حد تک کم ہو گئے۔ پھر چند سال بعد سلطان عبدالعزیز ابن سعود کے قومی اٹھنے بھی دوستانہ تعلقات پر اچھا اثر ڈالا۔ مگر فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی تحریک کے باعث بے چینی بڑھتی ہی رہی، فلسطین کے مفتی اعظم نے اپنی تمام توجہات اس تحریک کے مقابلہ کے لئے وقف کر دیں۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۵ء تک کے درمیانی زمانہ میں جب یہودی کثرت سے فلسطین میں آ کر آباد ہونے لگے۔ اور پھر ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء کے درمیان جب فلسطین میں باغیانہ

سرگرمیاں حد سے متجاوز ہو گئی، عربوں کی قلبی بے چینی اور برطانیہ کی طرف سے ان کی بے اعتمادی کا ظہور ہوا۔ اس کے بعد اگست ۱۹۳۵ء میں سلطان ابن سعود کی طرف سے بھی برطانیہ کی صیہونی پالیسی کے خلاف ایک سرکاری احتجاجی اعلان شائع ہوا، اور اس کی وجہ سے قوم پرستوں کا غیظ و غضب حد سے زیادہ ہو گیا۔ ان حالات کی وجہ سے اگر برطانیہ کو ستمبر ۱۹۳۸ء میں جنگ کے اندر کودنا پڑتا تو مشرق وسطیٰ میں ایک نہایت خطرناک صورتِ حالات پیدا ہو جاتی، یہ صحیح ہے کہ لندن کی فلسطین کا نفرنس اور برطانی پارلیمنٹ کی فلسطین کے لئے قرطاس ابھیض کی منظوری نے حالات کا رخ پلٹ دیا لیکن ابھی تک یہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا کہ حالات اپنی اصلیت پر آگئے ہیں، اتنا ضرور ہے کہ ایک دفعہ اور برطانیہ عظمیٰ اور عربوں کے تعلقات نئی امیدوں کے ساتھ تھوڑے بہت خوشگوار ہو گئے۔

ایک اور پیچیدگی جسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے وہ انگلستان اور فرانس کی لیوانٹ (Levant) یعنی بحرِ روم کا مشرقی حصہ اس کا ساحل اور جزائر وغیرہ کے بارے میں پرانی رقابت کا احیا تھا، بیس سال کی پوری مدت اسی کشمکش کی نذر ہو گئی۔ یہاں بحث اس سے نہیں کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ دیکھنا یہ ہے کہ اس کے اثرات کیا ہوئے؟ شام کے فرانسیسی افسروں کو آخر دم تک یہ یقین تھا کہ انکی دشواریوں کی وجہ برطانیہ کی خفیہ ریشہ دوانیاں ہیں پھر برطانیہ نے جب اپنے زیر نگین علاقوں میں فرانس کو مراعات دینے پر آمادگی ظاہر کی تو طبعی طور پر اس عمل مراعات نے شام کی اندونی بے چینی کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اور اس سے فرانس والوں کی ناراضگی بڑھ گئی۔

سابلے بے بعد میں سرکاری تعلقات اگرچہ خوشگوار رہے۔ لیکن فرانس کو یہ اندیشہ برابر لگا رہا کہ برطانیہ نے فرانس کو شام سے بالکل بے دخل کر دینے کا مخفی طور پر ارادہ کر رکھا ہے دوسری طرف شام کے قوم پرستوں پر فرانس کی اس ضد کا بھی اچھا اثر نہیں پڑا کہ شام کو مغربی ایشیا کے اس بنیادی نظام سے خارج رکھا جائے جسے اس کے ہمسایہ ملکوں کی اساسی ترقی کے لئے برطانیہ کے ممتاز دیرین ضروری سمجھے تھے۔

اس دوران میں عربوں کی قومی تحریک بھی خاموش نہیں رہی، جنگ عظیم کے بعد انھیں سخت مایوسی ہوئی تھی، اس مایوسی نے ان کے احساس کو اور تیز کر دیا تھا اور رائے عامہ کی یہ آرزو تھی کہ عربوں کی ایک متحدہ ریاست کا قیام عمل میں آئے۔ ایک مہموم امید کی بنا پر ہی اس کا خاکہ اور دستور بھی سنہ ۱۹۲۰ء تک بنالیا گیا تھا اور اب اس کیلئے عملی جدوجہد بھی شروع کر دی گئی۔ عربوں کی ترکیبی سے علیحدگی کے بعد اس جدوجہد کی پہلی منزل یہ قرار دی گئی کہ مسلمانوں کو یورپین اقتدار اور نفوذ وارثے آزادی دلائی جائے۔ اگرچہ یہ تحریک خاص اسلامی تحریک تھی لیکن پھر بھی عرب ہونے کی حیثیت سے عرب عیسائیوں کو اس تحریک میں نمایاں حصہ لینے سے نہیں روکا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ء کی عراق کی شورش اور سنہ ۱۹۲۵ء کی شام کی بغاوت قومی سے زیادہ مسلم تحریکیں تھیں۔ بعد کی شام و عراق کی تمام تحریکیں اسلامی جذبہ کے ماتحت تھیں۔ اس جذبہ کو اگرچہ الاقوامی جذبہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اسلام نے انھیں ایک رشتہ سے باندھ رکھا تھا۔ اور ان کے مذہبی عناصر کا ان تمام کانفرنسوں میں غلبہ راجح و قفا فوقتا اس غرض سے منعقد ہوئی تھیں کہ عربوں کے مشترک مسائل کی پالیسی میں یکجہتی پیدا کی جائے اور اتحاد عرب کی تحریک کو چند خاص مقاصد پر مبنی کر کے چلایا جائے۔ اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ عربوں کی قومی تحریک مراکو سے عراق تک پھیلی ہوئی تھی۔

اتحاد عرب کے اس عالمگیر جذبہ کے ساتھ ہر ایک عرب ملک میں وطنیت کا شدید احساس بھی موجود تھا۔ لیکن وطنیت کا یہ احساس کیسا ہی کیوں نہ ہو، اتحاد عرب تحریک کی راہ میں رکاوٹ کے جذبات اور مقاصد کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا تھا۔ عربوں کو اس کا پورا یقین تھا کہ مقامی طور پر زیادہ سے زیادہ طاقت و قوت حاصل کر کے مستقبل میں ایک عظیم الشان حکمران عرب مملکت قائم کی جاسکے گی۔ موجودہ وقت میں ممکن ہے کہ یہ احساس عربوں کی مختلف حکومتوں کے اندر فکر و عمل میں اتحاد پیدا کر دے اور انھیں ایک مرکز پر لے آئے، لیکن ڈراس کا بھی ہے کہ وطنیت کا یہ جذبہ اپنے دائرہ عمل تک ہی محدود ہو کر رہ جائے، اس کے آثار تقریباً ہر عرب ملک میں نظر آنے لگے ہیں، خصوصاً جہاں نوجوانوں کی کوئی پر جوش تحریک موجود ہے۔

عرب نوجوانوں کی موجودہ نسل جنگِ عظیم کے بعد اضطراب انگیز ماحول کی پیداوار ہے۔ ان نوجوانوں کو یاد ہے کہ ان کے بزرگوں نے مہمانِ وطن کی حیثیت سے برطانیہ یا فرانس کسی نہ کسی کے خلاف جنگ کی تھی، پھر ان کی تعلیم میں مظاہرے، ہڑتالیں اور ہنگامے بھی داخل ہیں جو حبِ وطن کے مقدس نام پر کئے جاتے ہیں یہ پودان چنروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے جن کی وجہ سے ان کے بزرگوں نے ناکامیاں اٹھائی تھیں یعنی اپنی نجی دھمپیوں کی تلاش میں رہنا، دفتروں کی خاک چھاننا، فارمولوں کے فریب میں آجانا وغیرہ، یہ جوان خون اپنے مذہبِ اسلام کی صلح جو یا نہ پالیسی کو بھی پسند نہیں کرتا، ان کا مسلک لڑنا ہے اور یہ خیال انھیں غیرت و لانا ہے کہ اتنی مدت سے عالمِ اسلامی پر غیروں کا قبضہ ہے اور انھیں تلوار کے ذریعہ نکال باہر نہیں کیا گیا۔ ان پر جرمنی والی کی نمایاں کامیابی کا افسوس ہے، جنھوں نے باوجود اقلیتوں میں ہونے کے ملکوں پر تسلط قائم کر لیا ہے اور اپنے غم سے دنیا کو مرعوب کر دیا ہے۔

(باقی آئندہ)

ترجمہ قرآن کیلئے ایک مفید اور معتبر کتاب

تیسرا القرآن

صوبہ بہار کے مشہور عالم مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی نے اس کتاب کو براہِ راست فقیرِ قرآن کے لئے بڑے سلیقہ اور جانفشانی سے مرتب فرمایا ہے۔ اس کتاب کی مدد سے قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کی صلاحیت زیادہ سے زیادہ سال ڈیڑھ سال میں پیدا ہو سکتی ہے، بشرطیکہ مولف کے بتائے ہوئے طریقہ پر توجہ سے عمل کیا جائے کتاب عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہونے کے لائق ہے صفحات ۸۰ بڑی تقطیع قیمت ۱/-

ملنے کا پتہ

نیچر مکتبہ برہان قروں بارغ دہلی